قرضوں کی بروقت واپسی میں ریاست وسماج کا کردار

محمد وصی فصیح بٹ*

ABSTRACT:

It is clear that prime responsibility of the defaulter is to clear the dues as early as possible, but the question is whether he/she is the only one to be held responsible to clear the debt, or according to Sharia other organs of society are also responsible? In other words, does Islamic jurisprudence includes external factors to minimize the risk of default or late payment?

To answer this question, when we referred the prime sources of Sharia and studied the era of the Prophet Muhammad (PBUH), we found that government, relatives and rich people were advised to help in such matters and the quota for helping the defaulter is allocated in various heads. So Sharia has adopted the method of risk sharing to minimize the said risk. If all the authorities play their role effectively then the dream of welfare state and Islamic society can come true.

یہ بات واضح ہے کہ مقروض کی اوّلین ذمہ داری واجبات کی جلد از جلد ادائیگی ہے۔تاہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ حق لوٹانے میں قرض خواہ ہی واحد ذمہ دار ہے یا اس کی مفلسی کی صورت میں معاشرے کے دوسرے طبقات بھی اس ذمہ داری میں شرعاً شریک ہوجاتے ہیں؟ بالفاظِ دیگر نظامِ اسلامی میں قرضوں کی تاخیر سے ادائیگی یا عدمِ ادائیگی کے خطرہ (Risk of default or late payment) کو کم کرنے کے لیے کیا خارجی عوامل (External Factors) کا عمل دخل ہے؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہم نے جب نصوصِ شریعت اور عہدِ رسالت کا مطالعہ کیا تو ہمیں نظر آیا کہ حکومتِ وقت، مخیّر حضرات، اور رشتے داروں کو اس سلسلے میں تعاون کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور مختلف مدات میں ایسے مقروض کی اعانت کو بھی اہم حصہ دیا گیا ہے۔بالفاظِ دیگر مذکورہ خطرہ (Risk) کو کم کرنے کے لیے شریعت نے اشتراکی طریقہ (Risk sharing) بھی اختیار کیا ہے۔اگر اجتماعی سطح پر یہ عناصر اپنا کردار بھرپور ادا کریں تو فلاحی ریاست اور اسلامی معاشرے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔

بیت المال سے اعانت

رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب بھی کسی ایسی میت کو لایا جاتا جس پر قرض باقی ہوتا تو آپؐ ہمیشہ یہ سوال کرتے ”کیا

* ریسرچ اسکالر، شعبہ علومِ اسلامی، جامعہ کراچی　برقی پتا: wasiefasih@hotmail.com

تاریخِ موصولہ: ۳۰ مئی ۲۰۱۴ء

اس نے اپنے قرض کے ادا کرنے کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟'' اگر مثبت جواب ملتا تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ورنہ اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے دیگر مسلمانوں کو نمازِ جنازہ ادا کرنے کا فرما دیتے۔مگر جب اللہ تعالیٰ نے اہلِ اسلام کو تونگری سے نوازا اور ریاستِ مدینہ خوشحال ریاست کے روپ میں ابھری تو بارگاہِ رسالت ﷺ سے یہ اعلان سنا گیا:

''میں ایمان والوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔اس لیے اب جو بھی مؤمن وفات پا جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے اور جو کوئی مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے۔''(۱)

یعنی یہ قاعدہ طے کر دیا کہ کسی بھی نادار مقروض کے انتقال کے بعد اس کے بارِ قرض کو باقی نہیں رکھا جائے گا بلکہ اس کی سبکدوشی کا انتظام کر دیا جائے گا۔

یہ ادائیگی بیت المال سے کی جاتی تھی۔عمومی خیال ہے کہ عہدِ رسالت میں کوئی بیت المال نہیں تھا بلکہ جب بھی آمدنی ہوتی ،فوری تقسیم کر دی جاتی تھی۔کوئی دائمی و منظّم نظام نہ تھا۔عجیب بات یہ ہے کہ مشہور مؤرخ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی عام خیال کے حامل تھے۔آپ لکھتے ہیں:

''زمانہ جاہلیت میں، اسی طرح عہدِ رسالت وعہدِ صدیقی میں بیت المال کے نام سے کوئی شعبہ متعارف نہیں تھا، کیونکہ اسلامی حکومت کے نقطۂ آغاز میں وسائلِ دولت اور آمدن کم تھی، جب کہ آپ کی مالی پالیسی یہ تھی کہ مال آتا اور فوری تقسیم فرما دیتے ،اگر صبح مال آتا تو دوپہر سے پہلے اور شام کو آتا تو رات گزرنے سے پہلے اس کو تقسیم فرما دیتے۔''(۲)

عمومی طور پر دیگر مصنفین نے بھی یہی نظریہ اپنایا ہے۔البتہ ہماری نظر میں یہ بات زیادہ سے زیادہ مدنی دور کے ابتدائی سالوں کے لیے تو ٹھیک ہوسکتی ہے،لیکن پورے عہدِ رسالت کے لیے اور طائف وخیبر جیسے متمول شہروں پر مشتمل ریاستِ اسلامی کے لیے یہ نظریہ رکھنا درست نہیں۔اس لیے ہم مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے متفق ہیں کہ:

''مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوۃ و السلام کے متصل ایک کمرہ تھا جس کی کڑی نگرانی بھی کی جاتی تھی۔اس میں سرکاری اموال اور اجناس رکھے جاتے تھے۔حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کی نگرانی کرتے تھے۔یہ پہلا بیت المال تھا اور حضرت بلال پہلے وزیرِ مالیات تھے۔''(۳)

لہٰذا زیرِ بحث حدیث کی بنیاد پر ہمارا مطالبہ ہے مفلس مقروض کی اعانت بیت المال سے بھی ہونی چاہیے۔نیز حدیثِ بالا میں اس اعلان کے الفاظ ''میں ایمان والوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں'' سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ مقروض میت کو سبکدوش کرنا صرف نبی کریم ﷺ کی خصوصیت تھی، کیونکہ یہ تو ہر عادل مسلم حاکم کی شان ہوتی ہے کہ وہ رعایا کا

خود ان سے زیادہ خیال رکھتا ہو۔

نیز یہ تو قرآن کا اسلوب بھی ہے کہ صیغہ بظاہر واحد کا ہوتا ہے لیکن اس سے مراد حضور ﷺ نہیں ہوتے بلکہ ان کی تبعیّت میں تمام مسلمان ہوتے ہیں۔زکوۃ کے مسئلہ میں بھی اس کی مثال موجود ہے۔ارشادِ باری ہے:

”(اے پیغمبر!) ان لوگوں کے اموال میں سے صدقہ وصول کرلو،جس کے ذریعے تم انہیں پاک کردو اور ان کے لیے باعثِ برکت بنوگے اور ان کے لیے دعا کرو۔“ (۴)

اب اس آیت میں خطاب خاص ہے، اور صیغہ انفرادیت کا ہے،لیکن اس آیت کی رو سے اسلامی ریاست کے ہر سربراہ کو اپنے عوام سے زکوۃ وصول کرنے اور اسے صحیح مصارف پر خرچ کرنے کا حق حاصل ہے۔اسی وجہ سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جن لوگوں نے آپ کو زکوۃ دینے سے انکار کیا، ان سے آپ نے جہاد کیا۔بالکل اسی طرح زیر بحث حدیث میں الفاظ خاص ہیں لیکن ان کے تحت ہر سربراہِ حکومت داخل ہے۔

ہماری تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں اس موقع پر حضور ﷺ سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں: (ترجمہ) ان میں سے کسی قرض دار کی وفات ہو جائے اور اس نے ادائیگی کے لیے کچھ نہیں چھوڑا ہو تو ہم پر اس کی ادائیگی کی ذمہ داری ہے (۵)۔ اس میں جمع کی ضمیر اس بات کی طرف مشیر ہے کہ یہ حضور ﷺ کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ تمام حکام کی ذمہ داری ہے۔حضرت ابوجعفر رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: غارمین (قرآنی اصطلاح) وہ مقروض ہیں جنہوں نے بلاضرورت قرض نہ لیا ہو، امامِ وقت کی ذمہ داری ہے کہ ان کا قرض بیت المال سے ادا کرے (۶)۔

اس مسلک کو حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کی تشریح کرتے ہوئے راجح قول قرار دیا ہے (۷)۔علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ تو اس مسئلہ میں اتنے پختہ ہیں کہ انہوں نے واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ ہر حاکمِ وقت پر لازم ہے کہ وہ ہر نادار مقروض میت کا قرض بیت المال سے ادا کردے۔اگر وہ ایسا نہیں کریگا تو روزِ قیامت اس سے قصاص لیا جائے گا اور دنیا میں وہ گناہ گار رہے (۸)۔وجہ یہی ہے کہ امامِ وقت رعیت کا نگہبان ہوتا ہے، دنیاوی مصائب اور اخروی جوابدہی کے اسباب سے نجات دلانا اس کے فرائضِ منصبی کا اہم حصہ ہوتا ہے۔

نیز بیت المال اس ادارہ یا شعبہ کا نام ہے جس میں مسلمانوں کی اجتماعی املاک محفوظ رکھی جاتی ہیں اور بوقتِ ضرورت ان کی مصالح وضروریات پر ہی خرچ کی جاتی ہیں۔صاحبِ ھدایہ لکھتے ہیں کہ ”بیت المال تو مسلمانوں کے مسائل کے لیے ہی رکھا گیا ہے۔“ (۹) لہٰذا مقروض وضرورت مند عوام کی بعد از مرگ چھٹکارے کا بندوبست اسی بیت المال سے ہونا قرینِ قیاس بھی ہے۔

شارحِ مؤطا علامہ سلیمان الباجی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کے مسلم حکمرانوں کا اس معاملہ کو جاری نہ رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صرف حضور ﷺ کی خصوصیت تھی (۱۰)۔لیکن ہمیں تو یہ تعامل حضرت عمر بن

عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں بھی نظر آتا ہے۔آپ نے عراق کے گورنر کو خط لکھا کہ کہ لوگوں کو عطیات دے دو۔ انہوں نے جواب میں لکھا: ''میں لوگوں کو عطیات دے چکا ہوں (لیکن پھر بھی) بیت المال میں مال باقی ہے۔'' آپ نے فوری حکم دیا کہ ''تم تلاش کرو ہر اس شخص کو جس نے بیوقوفی یا فضول خرچی کی وجہ سے قرض نہ لیا ہو، اس کی طرف سے قرض ادا کر دو''۔(۱۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس سرکاری حکم نامہ سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ بیت المال صرف اسی میت کے قرض ادا کرنے کا پابند ہے جس کے ریکارڈ سے اس قرض کی ضرورت ثابت ہو جائے۔ناجائز مقاصد، دکھلاوے، یا محض شادی بیاہ کی اضافی رسموں کی غرض سے لیے ہوئے قرضوں کی ادائیگی کی ذمہ داری بیت المال کی نہیں۔بعض احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فاسد غرض والے قرض شروع سے ہی مددِ الٰہیہ سے محروم ہوتے ہیں،لہٰذا ان کی زمینی مدد بھی روا نہیں ہونی چاہیے۔

نیز بیت المال میں اس مقروض کے حق کے تناسب کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ بیت المال قومی ملکیت ہوتا ہے،کسی ایک فرد کے تمام قرضہ جات اس سے ادا کرنا انصاف کے خلاف ہے۔اسلیے علامہ ابنِ بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مقروض کا بیت المال پر قرض کے بقدر حق ہو تو تمام قرض ورنہ جس قدر حق اس کا بنتا ہو اسی حساب سے بیت المال سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا(۱۲)۔اس حق کا حساب متعلقہ شخص کے ادا کردہ ٹیکسز،قومی مفاد کے کاموں اور اس کے کاروبار سے بیت المال کو پہنچنے والے مالی فوائد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

مفلس مقروض کی اعانت حکومتِ اسلامیہ کی ذمہ داری ہے۔اس مد کے لیے قومی خزانہ کا ایک مناسب حصہ مختص ہونا چاہیے۔ایک فارم ہر بالغ شہری سے پُر کروایا جائے جس میں ایک طرف اس کے کاروبار یا ملازمت کی نوعیت، اس سے قومی خزانہ کو ہونے والے فوائد،اس شہری کے جمع کردہ ٹیکسز کی تفصیلات درج ہوں۔ اس فارم کے دوسری طرف متعلقہ شخص کے ضروری قرضوں کی تعداد بھی درج ہو۔دونوں اعداد کے تناسب سے ایک رقم طے کر لی جائے جو حکومت اس شہری کے مفلس ہونے کی صورت میں ادا کرنے کی پابند ہوگی۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں اس انتظام کے لیے مرکزی بینک میں ایک کھاتہ ہونا چاہیے۔قرض خواہ، مالیاتی ادارے،اور بینک اپنے ناقابلِ وصول قرضوں کی رپورٹ مرکزی بینک کو دیں اور وہ صورتِ حال کی تحقیق کے بعد متعلقہ رقم ادا کر دے۔ نیز اس کھاتے کو قانونی طور پر ان کاروباری افراد اور اداروں کی امداد قرار دیا جائے جو دیوالیہ ہونے کے سبب ادائے قرض سے قاصر رہے(۱۳)۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے فلاحی ریاست کا خواب بھی شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔حکومت کی یقین دہانی کی وجہ سے قرض خواہوں کے سرمائے کے ڈوبنے کا امکان کم اور غریب سے غریب تر طبقہ کے لیے قرض کا حصول آسان ہو جائے گا۔

زکوٰۃ فنڈ سے اعانت

اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان فرمائے ہیں:

”صدقات تو دراصل حق ہے فقیروں کا، مسکینوں کا، اور ان اہلکاروں کا جو صدقات کی وصولی پر مقرر ہوتے ہیں، اور ان کا جن کی دلداری مقصود ہے۔ نیز انہیں غلاموں کو آزاد کرنے میں، اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں، اور اللہ کے راستے میں، اور مسافروں کی مدد میں خرچ کیا جائے۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک“۔ (۱۴)

ان آٹھ مصارف کے بیان کے لیے قرآن نے دو مختلف اسلوب اختیار کیے ہیں۔ پہلے چار مصارف کا حق حرفِ لام کے ذریعہ بیان ہوا (لِلۡفُقَرَآءِ) جبکہ باقی چار مصارف (جن میں مقروض بھی شامل ہے) کا ذکر حرفِ فی کے ساتھ ہے (وَ فِی الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِیۡنَ)۔ حرفِ فی ظرفیت کے معنی رکھتا ہے جس کی وجہ سے آیت کے اس حصہ کے معنی ہوئے کہ زکوۃ کو ان لوگوں کے اندر رکھ دینا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخری چار مصارف (جن میں ایک مقروض بھی ہے) زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں۔

لہٰذا قرآنی اسلوب کا تقاضا یہ ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی میں تنگدست قرض دار کو عام غرباء سے بھی زیادہ اہمیت دینی چاہیے کیونکہ وہ عام فقراء سے زیادہ تنگی میں ہے، اپنے اخراجات کی فکر سے بھی زیادہ اسے قرض خواہوں کی فکر اس کے ذمہ ہے (۱۵)۔ فقہا کرام بھی مفلس مقروض کے ساتھ اس ترجیحی سلوک کی تاکید فرماتے ہیں۔ علامہ ابنِ نجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ ”جس پر ادھار کا بوجھ ہو اسے زکوٰۃ دینا عام فقیر سے زیادہ بہتر ہے۔“ (۱۶) اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عام فقراو مساکین کو مدِّ زکوٰۃ سے محروم رکھا جائے اور زکوۃ صرف مقروض کو دی جائے، بلا شبہ معاشرے کے غریب و پسماندہ طبقے کی محرومیوں کے ازالے کے لیے مصرفِ زکوۃ بہت اہم ہے اور قرآن وسنت میں فقرا کی اعانت زکوۃ سے کرنے والوں کے لیے متعدد فضائل وارد ہوئے ہیں، تاہم زکوۃ کا مجموعی بہاؤ انہی عام فقرا کی طرف رکھنا اور نادار مقروضوں کو یکسر فراموش کر دینا عملی بے اعتدالی ہے، اسی وجہ سے ہمارے معاشرے میں غرباء وفقراء کی زکوۃ سے مدد کا تو پھر بھی رواج ہے لیکن سفید پوش مقروض کی اس مد سے اعانت خال ہی خال نظر آتی ہے۔ لہٰذا راہِ اعتدال یہی ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی میں غربا کے ساتھ ساتھ مقروضوں کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے۔

قرآن کریم نے مقروض کے لیے غارم کی اصطلاح استعمال کر کے بھی اس کے زیادہ مستحقِ زکوۃ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ زجاج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غرم کسی سخت چیز کے لازم ہو جانے کو کہتے ہیں، دوزخ کے عذاب کو بھی اسی لیے غرام کہا گیا ہے اور عشق کے دائمی روگ کو بھی غرم کہا جاتا ہے۔ قرض دار پر بھی فکرِ قرض دن رات سوار رہتی

ہے اسی لیے اسے غارم کا عنوان دیا گیا ہے (۱۷)۔

نبی کریم ﷺ نے بھی ان لوگوں کی جو قرض کے زیرِ بار آجائیں اور کوشش کے باوجود ادائیگی نہ کرسکیں، زکوٰۃ وصدقات کے مد سے تعاون کرنے کی ترغیب دی ہے۔ عہدِ رسالت میں ایک شخص نے ایک باغ خریدا لیکن اس کے تمام پھل ضائع ہوگئے اور یوں وہ اپنے واجبات کی ادائیگی سے معذور ہوگیا۔ یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے عام اعلان فرمایا کہ ''اس پر صدقہ کرو۔'' (۱۸)

اگرچہ شریعت کا عمومی ضابطہ یہ ہے کہ انسان کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، زکوٰۃ وصدقات طلب نہ کرے، لیکن نادار مقروض کو اس سے استثنا دیا گیا ہے، اسے زکوٰۃ طلب کرنے کی گنجائش ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''غنی آدمی اور توانا آدمی کو سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ ایسے آدمی کو جائز ہے جس کو ناداری وافلاس نے زمین پر گرادیا ہو یا جس پر قرض کا بھاری بوجھ پڑ گیا ہو۔'' (۱۹)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ محض مقروض ہونا مستحقِ زکوۃ ہونے کے لیے کافی نہیں، اس کے لیے فقر شرط ہے جس کا شرعی معیار نصابِ زکوٰۃ ہے۔ یعنی ایسا مقروض جو اپنے سارے اثاثے قرض میں دے دے تو ان کے پاس نصابِ زکوۃ، یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر مال باقی نہ رہے۔ لہٰذا ایک مالدار آدمی جس نے اضافی ضروریات کے لیے قرض لیا ہو اس کی اعانت زکوۃ فنڈ سے نہیں کی جاسکتی۔ قاضی ابوسعود رحمۃ اللہ علیہ الغـرمین کی تشریح میں لکھتے ہیں،

''وہ لوگ جنہوں نے ذاتی جائز ضروریات کے لیے قرض لیا ہو اور اس قرض کے علاوہ ان کے پاس نصابِ مال نہ ہو۔'' (۲۰)

نیز اس سلسلے میں یہ مسئلہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ زکوۃ ایک عبادت ہونے کی وجہ سے بغیر نیت کے معتبر نہیں اور نہ ہی ادائیگی کے بعد نیت کی جاسکتی۔ لہٰذا کسی غریب مستحق کے ذمہ قرض ہو تو اسے محض معاف کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ صحیح صورت یہ ہے کہ اس مقروض کو زکوۃ کی نیت سے مال دیا جائے، اس کے مال پر قبضہ کرنے سے زکوۃ ادا ہو جائے گی، پھر اس سے اپنے قرض کے طور پر وہ مال واپس لے لیا جائے (۲۱)۔

زکوۃ فنڈ کا قیام اور اس میں قرض نادہندگان کے لیے ایک مد مخصوص کرنا شرعی تقاضا ہے۔ بالخصوص ادھار اقساط پر خرید وفروخت کرنے والے تاجروں اور مالیاتی اداروں کو یہ سہولت ملنی چاہیے جس کے ذریعہ وہ اپنے ہر مفلس گاہک کی بقیہ اقساط شرعی طریقہ کار کے مطابق زکوۃ فنڈ سے وصول کرسکیں۔ اس سے تاجروں کو بھی اپنے سرمایہ کی وصولیابی کا یقین رہے گا جس کی وجہ سے سرمایہ کاری کی شرح میں بھی اضافہ ہوگا۔

اہلِ تعلق کی ذمہ داری

انسان صرف اپنی ذات پر بھروسہ کر کے قرض کی ذمہ داری نہیں اٹھاتا بلکہ وہ ایک سماجی قوت اور خاندانی پشت پناہی کو اپنے پیچھے محسوس کرتا ہے۔ یہ خیال اسے ہمیشہ رہتا ہے کہ اس کے نادار ہونے پر اسے مددگار و معاون مل جائیں گے۔اسی لیے اجتماعی کفالت وتعاون کا طریقہ مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے اور نادار مقروض کا قرضہ ادا کرنے کی رشتے داروں کو پرزور ترغیب دی گئی ہے۔

سعد بن اطول رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا بھائی فوت ہو گیا اور تین سو دینار قرض بھی چھوڑ گیا۔اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی۔اب ان یتیم بچوں کی کفالت میرے ذمہ تھی۔میں نے چاہا کہ اپنی طرف سے ان معصوموں پر خرچ کروں لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''تمہارا بھائی اپنے قرض کی وجہ سے قید میں ہے، پہلے اس کا قرضہ ادا کرو''۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تعمیلِ ارشاد میں تمام قرضہ اتار دیا اور خدمتِ اقدس میں عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! تمام قرضہ ادا ہو گیا،بس ایک عورت باقی رہتی ہے، وہ دو دینار بھائی کے ذمہ بتاتی ہے لیکن اس پر گواہ کوئی نہیں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''اس کی بھی ادائیگی کر دو، وہ سچی ہے۔''(۲۲)

اس حدیث میں رشتے داروں کو اعانت پر ابھارا گیا ہے جس کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فوری اثر ہوا۔حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کے قرض کی ادائیگی کے لیے اتنی تیزی سے بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے کہ خود فرماتے ہیں، ''گویا میں آگ کا ایک شرارہ تھا''۔(۲۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہوئے اور جانبر ہونے کی صورت نظر نہیں رہی تو آپ نے اپنے صاحبزادے کو تاکید فرمائی کہ ان کے ذمہ چھیاسی ہزار کا قرضہ ہے، اسے اوّلاً خاندانِ عمر کے مال سے ادا کیا جائے، اگر بچ جائے تو عدی بن کعب کے گھرانہ سے مدد لی جائے، اس کے بعد تمام قریش سے(۲۴) یعنی قبیلہ کی شاخوں میں بھی قریب تر کی ذمہ داری مقدم ہے۔

ذخیرہ احادیث میں اسی نسبت سے ایک اور نص بھی موجود ہے جس میں حضور ﷺ نے ایک مقروض میت کی جنازہ پڑھانے سے پہلے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا:

> ''یہ شخص اپنے قرض کی وجہ سے (جنت سے) روک دیا گیا ہے۔لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس کے کنبہ والے اور اس کے معاملہ کی فکر کرنے والے لوگ اٹھیں اور اس کی طرف سے ادائیگی کریں۔''(۲۵)

اس حدیث نے معاونین کی فہرست میں اور اضافہ کر دیا۔یعنی نادار مقروض کی اعانت صرف خونی رشتے داروں کی ذمہ داری نہیں بلکہ اس میں ہر اس شخص کو آگے بڑھنا چاہیے جو مقروض کے معاملہ پر نظر رکھ سکتا تھا۔فی زمانہ اس کا

بہترین مصداق ہم پیشہ یا ایک محکمہ کے ملازمین ہوسکتے ہیں۔جس طرح اہلِ خاندان انسان کے لیے مددگار ہوتے ہیں اسی طرح ان سے کہیں زیادہ ہم پیشہ افراد سے انسان سہارا محسوس کرتا ہے۔ایک سوسائٹی کے رہائشی افراد بھی اسی کے مصداق ہیں۔

معاشرے میں بسنے والے خاندان، کاروباری برادریاں اور ملازمین کی یونینز''امدادِ قرض'' کے عنوان سے ایک فنڈ قائم کریں اور تمام وابستہ افراد کو ان کی آمدنی کا ایک معقول حصہ اس میں شامل کرنے کی ہدایت دیں۔اس فنڈ کی باقاعدہ نگراں کمیٹی ہو جو برادری کے تمام افراد،ان کی آمدن، اخراجات، دیانت داری اور سابقہ مالی معاملات کا ریکارڈ رکھے، تمام افراد کی انہی اعداد وشمار کی روشنی میں درجہ بندی کرے۔دوسری طرف بینک، قسطوں میں خرید وفروخت کرنے والے ادارے، اور دیگر قرض کنندگان اس بات کی پابندی کریں کہ وہ قرض مانگنے والے یا ادھار معاملہ کرنے والے کی برادری کے علم میں یہ معاملہ لائیں اور ان سے متعلقہ فرد کے قابلِ اعتماد ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں۔

اس پیشگی کارروائی سے معاشرے میں اعتماد کی فضا عام ہوگی، قرضوں کے ڈوبنے یا بتاخیر ادائیگی کی شرح (Risk of default or late payment) انتہائی کم ہو جائیگی کیونکہ برادری کے اطمینان دلانے کے بعد اس معاملے میں فردِ واحد تنہا ذمہ دار نہیں رہے گا بلکہ اس کے مفلس یا مماطل (تاخیر) ہونے کی صورت میں بقیہ اقساط وقرضے کی ادائیگی اسی''امدادِ قرض'' سے کی جائے گی اور یوں عدم ادائیگی کے خطرے (risk) کو اشتراکی طریقے (risk sharing) سے ارکان پر تقسیم کر دیا جائے گا اور فردِ واحد کو اس مالی بوجھ کے اثرات سے بھی محفوظ کر دیا جائے گا۔

حاصلِ مقالہ

خلاصہ یہ ہے کہ رشتے داروں، ہم دفتر ساتھیوں، سماجی حلقوں سے منسلک افراد کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ متعلقہ مفلس مقروض کی مدد کریں۔اس مقالے میں اس سلسلے کے عملی اقدامات تجویز کر دیے گئے ہیں۔ہمارے معاشرے میں اس کے عملی نفاذ کے ساتھ ساتھ امدادِ باہمی کی درست ترتیب قائم کرنے کی ضرورت ہے۔قرآنِ کریم کی آیت اور فقہی حوالے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عام مسکین وفقیر کی اعانت کے ثواب سے بھی زیادہ مقروض کو بارِ قرض سے نجات دلانا باعثِ ثواب ہے، شرط یہ ہے کہ اس مقروض کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ قرض ادا کر سکے۔اسکی حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ مقروض ادائیگی کی ذمہ داری لے کر معاشرے کا ایک ذمہ دار رکن بنتا ہے جبکہ صدقہ میں اس کا احتمال موجود ہوتا ہے کہ صدقہ لینے والا فرد اس عمل کا عادی ہو جائے اور نتیجتاً معاشرہ میں ایک عضوِ معطل کا اضافہ ہو جائے۔لہٰذا مخیّر حضرات اور زکوٰۃ فنڈ کے افسران کی ذہن سازی کی جائے کہ وہ زکوٰۃ، خیرات، اعانت کے فنڈز کا رخ عام فقرا و مساکین کے ساتھ ساتھ مقروضوں کی طرف بھی کریں۔

مراجع وحواشی

(۱) بخاری، محمد بن اسماعیل (۱۴۲۹ھ)، صحیح البخاری (طبع چہارم)، کتاب الکفالۃ، باب الدین، رقم الحدیث ۲۲۹۸، ریاض: دارالسلام للنشر والتوزیع

(۲) ذہبی، محمد بن أحمد بن عثمان (۱۳۳۷ھ)، دولۃ الاسلام فی التاریخ (طبع سوم)، ج۱، حیدرآباد ہند: دائرۃ المعارف النظامیہ، ص۸

(۳) حمید اللہ، محمد (۱۹۷۸ء)، خطباتِ بہاولپور (طبع دوم)، بہاولپور: جامعہ اسلامیہ بہاولپور، ص۱۸۳

(۴) القرآن ۹:۱۰۳

(۵) بخاری، بحوالہ بالا، کتاب الفرائض، باب قول النبی ﷺ: من ترک مالا فلاھلہ، رقم الحدیث ۶۷۳۱

(۶) طبری، محمد بن جریر (۱۴۲۶ھ)، جامع البیان فی تاویل القرآن (طبع چہارم)، ج۶، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ص۴۰۲

(۸) عسقلانی، احمد بن علی بن حجر (۱۴۲۱ھ)، فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب الفرائض، باب قول النبی ﷺ: من ترک مالا فلاھلی، ج۱۲، ریاض: دارالسلام، ص۱۳

(۸) عینی، بدرالدین محمود بن احمد (۱۹۸۷ء)، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (طبع پنجم)، کتاب الحوالہ، باب الدین، ج۱۲، کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، ص۱۷۸

(۹) مرغینانی، علی بن ابی بکر (۱۹۸۵ء)، الھدایۃ، کتاب السیر، ج۲، لاہور: مکتبہ رحیمیہ، ص۵۴۴

(۱۰) الباجی، سلیمان بن خلف بن سعد (۱۴۲۰ھ)، المنتقی شرح الموطا، کتاب الجھاد، ج۴، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ص۴۱۲

(۱۱) ابوعبید، قاسم بن سلام (۱۴۲۸ھ)، کتاب الاموال، باب تعجیل اخراج الفیء، ج۱، مصر: دارالھدی النبوی للنشر والتوزیع، ص۳۶۳

(۱۲) ابن بطال، علی بن خلف (۱۴۲۴ھ)، شرح ابن بطال علی صحیح البخاری (طبع اوّل)، کتاب الحوالہ والکفالہ، باب من تکفل عن میت، ج۶، بیروت: دارلکتب العلمیہ، ص۳۵۴

(۱۳) صدیقی، نجات اللہ (۲۰۰۰ء)، غیر سودی بینکاری (طبع دوم)، لاہور: اسلامک پبلیکشنز، ص۸۳

(۱۴) القرآن ۹:۶۰

(۱۵) زمخشری، محمود بن عمر (۱۴۱۴ھ)، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، ج۲، قم: مکتب الاعلام الاسلامی، ص۲۸۳

(۱۶) ابن نجیم، عمر بن ابراہیم (۱۹۸۸ء)، البحر الرائق شرح کنز الدقائق (طبع سوم)، کتاب الزکاۃ، باب المصارف، ج۲، کوئٹہ: مکتبہ ماجدیہ، ص۲۴۲

(۱۷) رازی، محمد بن عمر بن الحسین (۱۴۲۱ھ)، التفسیر الکبیر او مفاتیح الغیب، ج۱۶، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ص۹۰

(۱۸) سجستانی، ابوداؤد، سلیمان بن اشعث (۱۴۲۹ھ)، سنن ابی داؤد (طبع چہارم)، کتاب البیوع، باب وضع الجائحہ، رقم الحدیث ۳۴۶۹، ریاض: دارالسلام للنشر والتوزیع

(۱۹) ترمذی، محمد بن عیسی (۱۴۲۹ھ)، جامع الترمذی (طبع چہارم)، کتاب الزکاۃ، باب ماجاء من لاتحل لہ الصدقۃ، رقم الحدیث ۶۵۳، ریاض: دارالسلام للنشر والتوزیع

(۲۰) ابوالسعود، محمد بن محمد بن مصطفی (۱۴۲۴ھ)، ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم (طبع دوم)، ج۳، بیروت: دارالفکر، ص۴۰۳

(۲۱) شامی ،محمد امین ابن عابدین (۱۴۰۶ھ)، حاشیۃ رد المحتار علی الدر المختار (طبع پنجم)، کتاب الزکاۃ، مطلب فی زکاۃ ثمن المبیع، ج۲،کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی،ص ۲۷۱

(۲۲) حنبل ،احمد بن (۲۰۰۵ء) ،مسند أحمد، مسند الشامین (طبع سوم)، حدیث سعد بن الاطول، رقم الحدیث ۱۷۳۵۹، بیروت: بیت الافکار الدولیۃ،ص ۱۲۲۳

(۲۳) ایضاً،رقم الحدیث ۱۴۲۱۴،ص ۹۷۱

(۲۴) بخاری، بحوالہ بالا، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قِصَّةُ الْبَيْعَة، وَالاتِّفَاقُ عَلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رضی الله عنه، رقم الحدیث ۳۷۰۰

(۲۵) بیہقی ،أحمد بن الحسین (۱۹۹۹ء)،السنن الکبری (طبع دوم)،کتاب التفلیس ، باب حلول الدین عن المیت ، ج۶، ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ،ص ۴۹